تحقیقی مجلہ "تصدیق"، شعبہ اردو، رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی فیصل آباد

جلد 02 شمارہ 04، 2022

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

CC BY
OPEN ACCESS

ڈاکٹر فوزیہ شہزادی / عاطف منظور

لیکچرر اُردو (وزیٹنگ)، ڈویژن آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

ڈاکٹر محمد امجد عابدؔ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Dr. Fouzia Shehzadi/ Atif Manzoor
Lecturer Urdu (Visiting), Division of Education, University of Education, Lahore
Dr. Muhammad Amjad Abid
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Education, Lahore

تحقیق اور "ادبی تحقیق": ایک محاکمہ

RESEARCH AND "ADBI TEHQEEQ": CRITICAL DISCOURSE ANALYSIS

DOI: https://doi.org/10.56276/tasdiq.v4i02.122

ABSTRACT

Regardless of Science or literature, there is no aspect of social life beyond the research. Creation without research deprived from track and sources of originality. Foreseeing the same significance of the phenomenon a potential number of researchers in Urdu literature have enumerated a dignified place. As a potential contributor, Dr. Jamil Jalbi is one of the same who added valuable food for thought and brainstorming for literary criticism and research culture for the scholars. Through his vision research and criticism have amalgamated in a tone of creation and art for life. His phenomenological style of research leads to criticism. Critical vision always justifies the thinking process logically which reflects feeling, observation, and sensitivity.

ADBI TEHQEEQ is one of the authentic road maps for researchers authored by " Dr. Jamil Jalbi" in which the author's viewpoint about theory and practice and research methodologies have been narrated. The researcher has concluded through critical discourse analysis of "ADBI TEHQEEQ" that Jamil Jalbi as a school of thought has authentic views regarding research and criticism in literature. Dr. Jamil Jalbi being a multidimensional personality in ADBI TEHQEEQ explored multi aspects of literary criticism and literary history. For future researchers and critics, it is a reference and a glowing monument for guidance. As stated by Ahmed

KEYWORDS

Dr Jamil Jalbi, Literature, Criticism, Art, Discourse, Critical vision, Authentic, Creation, Phenomenological, Researcher

Received: 13-Dec-22
Accepted: 10-Jan-23
Online: 14-Jan-23

Nadeem Qasmi As an authority in literary criticism, the dignity of ADBI TEHQEEQ is not only beyond doubt but unavoidable for valuing /ranking/assessing any masterpiece in literary studies. The article on Tehqeeq Kay Jadeed Ruhjaanat reflects the significance of research under specific advocacy with in-between-the-line hard and fast rules to follow strictly and institutional barrenness in higher education institutions. Global vision and humanism distinguish him from Longinus and Arnold Bennett in the field of literary criticism. Critical thinking, secondary imagination and reflection of political epistemology are knacks of Jamil Jalbi which inspired the scholastic elite to acknowledge his contribution to introducing the sightedness of life canvas. His contribution is prismatic which inspired the researchers from dogmatism to pragmatism in literary criticism.

دنیائے علم و ادب کا یکسر نو آموز طالب علم بھی اس بات سے واقف ہے کہ زندگی کا خواہ کوئی بھی شعبہ ہو تحقیق کے بغیر کوئی کار انجام بخیر نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ تحقیق کے بغیر تخلیق بھی لڑکھڑا جاتی ہے۔ ادب کے میدان میں اگر گھٹنوں کے بل بھی چلنا ہو تو بھی تخلیق کا دامن تھامے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ تحقیق نہ صرف علم کو وسیع کرنے کا ذریعہ ہے بلکہ علم و ادب کے راستے کی پیچیدگیوں کو اس کا سرا تھام کر حل بھی کیا جا سکتا ہے۔ حق کا ساتھ دینا ہو یا باطل کو جھٹلانا ہو؛ تحقیق کے بغیر یہ دونوں کام سرانجام نہیں پا سکتے ہیں۔ تحقیق ہی وہ ادنیٰ بیج ہے جس سے دنیائے علم و ادب میں استناد کے تناور درخت پھوٹتے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی میدان ہو تحقیق کے ذریعے اس میں نظریات قائم کیے جاتے ہیں۔ طب، ریاضی، تعلیم، فلکیات، تعمیرات، نباتات غرض کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں تحقیق نے اپنی اہمیت کا اعتراف نہ کرایا ہو۔ اگر تحقیق نہ ہوتی تو سائنسدان بڑے بڑے طوفانوں کا رخ موڑ کر انسانی نسل کو نہ بچا سکتے، ایسی اور بھی کئی گونہ گوں مثالیں ہیں جو یقیناً سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بنا تحقیق علم کی کوئی بھی شاخ ادھوری ہے۔ تحقیق کے ذریعے ہی ہم اپنی روزمرہ زندگی کو حقیقی اصولوں پر ڈھال سکتے ہیں۔

لفظ تحقیق کا مادہ ح ق ق ہے جس کے معنی درست سچ کھرا موزوں وغیرہ لیے جا سکتے ہیں علمی اردو لغت میں اس کی تعریف یوں آئی ہے:

> "تحقیق [ع-امث] 1 اصلیت معلوم کرنا، دریافت کرنا 2 درستیٔ صحت 3 تفتیش-جانچ پڑتال 4 سچائی-صداقت-اصلیت 5 یقین 6 تصدیق-پایۂ ثبوت کو پہنچنا 7 ٹھیک-سچا-اصلی-یقینی" (۱)

لفظ تحقیق اردو ادب میں انگریزی کے توسط سے آیا انگریزی میں اس کے لیے ریسرچ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انگریزی زبان و تہذیب پر فرانسیسی اثرات نمایاں ہیں لہٰذا یہ لفظ بھی فرانسیسی ہی کی مرہونِ منت ہے ڈاکٹر محمد اشرف کمال کے بقول:

"تحقیق (Research) کا لفظ فرانسیسی لفظ Recharcher سے ماخوذ ہے جس کا مطلب تلاش و تحقیق ہے۔ انسانی معاشرے میں تحقیق کے فعال اور مؤثر کردار سے کوئی بھی ہوشمند اور ذی عقل انکار نہیں کر سکتا۔"(۲)

مذکورہ تعریف میں دوسرا جملہ بڑا معنی خیز ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی باشعور انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ تحقیق طرز حیات کی بنیاد ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں تحقیق کی اہمیت سے انکار کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق اور مبادیات تحقیق کو ادب میں بھی اتنی ہی اہمیت کا حاصل گردانا جاتا ہے۔ لفظ تحقیق کے لغوی معنی کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے 'جو باب تفعیل سے مصدر ہے: حق، یحقق، تحقیقا۔ محقق (تحقیق کرنے والا)، محقق (تحقیق شدہ)، جب کہتے ہیں: حقق فلاں تو اس کے معنی ہیں فلاں نے تحقیق کی یعنی "اصلیت کو معلوم کیا"، دریافت کیا، کھوج لگایا، تفتیش کی، حقیقت کو ثابت کیا۔"(۳)

رانا سلطان محمود نے "فن تحقیق مبادیات اصول اور تقاضے" میں تحقیق کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

"کسی نامعلوم حقیقت کو معلوم کر کے عام آگہی میں لانا اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لیے معلوم کردہ حقیقت پر تجزیاتی و تفتیشی نظر ڈال کر نتائج اخذ کرنا تحقیق ہے۔"(۴)

دراصل تحقیق ہر وہ عمل ہے جو ہم اپنی زندگی میں سرانجام دیتے ہیں زندگی میں کیا جانے والا ہر عمل خواہ خوش لباسی اور خشک خوراکی جیسا ادنی ہی کیوں نہ ہو تحقیق کے عمل سے لازمی دوچار ہوتا ہے۔ لباس اور خوراک کے بنیادی مسائل سے لے کر بڑے بڑے ادبی معرکوں اور فن پاروں کی تخلیق تک ہر عمل تحقیق سے گزر کے ہی انجام کو پہنچتا ہے۔ بقول کرافورڈ(Crawford) :

"تحقیق کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ یہ ایسے مسائل کے مطالعے کا ایک طریقہ ہے جن کے حلوں کا استخراج جزوی طور پر یا کلی طور سے حقائق سے کیا جاتا ہو۔"(۵)

مسائل کے تدارک کی تلاش نہ صرف انسان کا بنیادی نقطہ نظر ہے بلکہ یہی انسان کا ضابطہ حیات رہا ہے کہ وہ ہمیشہ زندگی کو آسان بنانے اور روانی کے ذرائع کرنے کا متلاشی تھا۔ مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے کا یہ عمل ایک سراسر سائنسی اور منطقی عمل ہے یہ اندازوں اور قیاسات کی بنیاد پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے تراشیدہ ذہنی اپچ اور ذہن کی مکمل سرگرمی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ذہنی کار ہے اور اس کے لیے ذہنی مشق بھی نہایت معروضی ہونی چاہیے منطقی اور معروضی عمل کے بغیر تحقیق کار بے مصرف کے سوا کچھ بھی نہیں رہ جاتی اس کی معروضیت (objectivity) اور منطق (logic) ہیں اس عمل کو مصدقہ اور معتدل بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ڈاکٹر عطش درانی نے تحقیق کی اس معروضیت پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ان کے نزدیک ادب میں معروضیت کے دائرہ کار تک محدود رہنا ایک کارِ دشوار ہے۔ لکھتے ہیں:

"تجرباتی اور آلاتی تحقیق میں معروضیت یا غیر جانبداری با آسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن دستاویزی تحقیق میں معروضیت کی

تلاش اور اطلاق بہت مشکل کام ہوتا ہے وجہ صاف ظاہر ہے کہ ادبی فن پارے کا حسن زبان دان اور ادیب کی سماجی حیثیت رجحانات اور حدود سے معنوی تعبیرات (connotations) میں موجود ہوتے ہیں جنہیں معروضی گرفت میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ فنی کیفیات کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا محض تنقیدی اصول برت کر جو اکثر خود بھی معروضی نہیں ہوتے معروضی نتائج نکالنا مشکل ہوتا ہے۔"(۲)

ہر زبان کے میدان ادب و تحقیق میں چند ہیر اصفت انسان ایسے ہوتے ہیں جن کو علم و سخن کی حاجت نہیں رہتی بلکہ وہ خود اس کا چہرہ بن جاتے ہیں۔ ایسے فنکار نہ صرف زبان و ادب کی خدمت کرتے ہیں بلکہ اسے ان نئی تعبیرات سے روشناس کراتے ہیں جو دیگر لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہوتیں۔ ایسے افراد ادوار پر فتن کی انارکی سے پرے اپنے لیے ایک جہان تخلیق کر لیتے ہیں جہاں ان کا قلم انہیں لازوال بنا دیتا ہے۔ ایسے افراد دنیا کی ہر زبان میں موجود ہوتے ہیں اردو زبان کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اگرچہ یہ یونانی، لاطینی، انگریزی، فارسی اور ہندی جیسی قدامت کی حامل تو نہیں ہے لیکن اسے ایسے افراد میسر رہے ہیں جو کمال فن تھے۔ آج اردو زبان کتنی ہی ناپرساں اور پریشاں حالی کا شکار ہو لیکن آج بھی اس سے چند ایسے معتبر نام جڑے ہوئے ہیں جو اس کی آبرو ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ محبت کا یہ سلسلہ دوطرفہ ہے۔ ان شخصیات میں اردو علم وادب کو نوازا تو اردو میں بھی انہیں خالی دامن نہیں رکھا بلکہ ان کے نام آج اردو سے تعلق کی وجہ سے دنیا میں امر ہو چکے ہیں۔ ایسے ہی نابغہ کمال لوگوں میں ایک نام ڈاکٹر جمیل جالبی کا ہے۔ ان کو دانشور، عالم، ادیب، نقاد، ماہر لسانیات جیسے کئی القابات دیے جاسکتے ہیں لیکن تشنگان تحقیق کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام جس سیر ابی کا باعث ہے باقی میدان اس کے سامنے ویران دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بچپن ہی سے گھر میں ادبی ماحول پایا اور پھر تمام عمر اسی دشت کی سیاہی میں گزار دی۔ اپنے تحقیقی کارناموں کے سبب ڈاکٹر صاحب کو بطور محقق ایک معتبر جانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سنگلاخ میدان تحقیق کے ان گنے چنے مجاہدوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے تحقیق کو تخلیق کی سطح سے جاملایا۔ ان کے ہاں تحقیق کوئی نپی تلی سائنسی شے نہیں رہتی بلکہ اس سطح سے اٹھ کر تخلیق کا جہاں نما بن جاتی ہے۔ ان کی تحقیق جب تخلیق کی بھٹی سے گزرتی ہے تو وہ کندن بن جاتی ہے جس پر تخلیق بھی رشک کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے لفظوں کا جمالیاتی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ محض ایک روایتی محقق نہیں بلکہ وہ تو ایک تخلیق کار ہیں جو اپنی تحقیق سے اوروں کی تخلیق کو حنوط کر کے اسے جلا بخشتے ہیں۔

میدان تحقیق میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ایک اہم تصنیف "ادبی تحقیق" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ بطور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا طریقہ کار اور تحقیق کے متعلق ان کے نظریات اس کتاب میں واضح ہو کر سامنے آئے ہیں۔ یہ کتاب متفرق موضوعات کی حامل ہے جس میں تیرہ عنوانات کے تحت مختلف مضامین درج کیے گئے ہیں۔ یہ تمام مضامین ڈاکٹر جمیل جالبی کے انداز تحقیق کے نمائندہ ہیں جن سے ان کی تحقیق کے طریقہ کار اور نظریات کے بارے میں معنی خیز معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان مضامین کی بوقلمونی کے پہلو کی طرف احمد ندیم قاسمی نے بطور خاص توجہ دلائی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"جس طرح ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت متنوع ہے، اسی طرح "ادبی تحقیق" کے مندرجات بھی متنوع ہیں اور بعض مضامین تو ایک طرح سے انکشافات ثابت ہوں گے کہ ان میں بیشتر ایسی معلومات جمع ہیں جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "ادبی تحقیق" (جو ادبی تنقید کا بھی مرتبہ رکھتی ہے) معاصر اردو ادب میں ایک ایسی تصنیف ثابت ہو گی جس کے حوالے کے بغیر مستقبل کا کوئی بھی ادبی مورخ یا محقق یا ناقد اپنے موضوع کے ساتھ کماحقہ انصاف نہیں کر سکے گا۔ "(۷)

متفرق موضوعات کی حامل ہونے کے سبب یہ کتاب محققین کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس مختصر سی کتاب کے مندرجات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ اختلاف موضوع کی وجہ سے یہ کتاب مختلف تحقیقی موضوعات کی ایک قوس قزح بن گئی ہے جس میں ہر موضوع اپنی انفرادیت کی وجہ سے الگ چمک رکھتا ہے۔ "ادبی تحقیق" میں متفرق موضوعات کے حامل مقالات کو مجتمع کر دیا گیا ہے تا کہ نو آموز محققین کے لیے آسانی بہم پہنچائی جا سکے۔ اس طریقہ کار کو سائنسی اور منطقی عمل کہا جا سکتا ہے جو اپنی معروضیت کی وجہ سے تحقیق کے لیے بالکل موزوں ہے۔ تحقیق بے لاگ شعبہ ہے جس میں تخیل کی کارفرمائی کم سے کم ہوتی ہے لہٰذا اس کے لیے ایسی کتب جو بے لاگ اور معروضی انداز میں متلاشی کو مقصود تک پہنچا سکیں ایک بہترین اضافہ ہیں۔ "ادبی تحقیق" تحقیق کے اس سائنسی اور معروضی معیار پر پورا اترتی ہے۔

"ادبی تحقیق" کا سب سے دلچسپ حصہ اس کا پیش لفظ ہے جو احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے۔ اس پیش لفظ کی اہمیت اس لیے بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ اس میں احمد ندیم قاسمی نے بطور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کے محاسن اور خوبیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ان کے مطابق ادبی، تحقیق ڈاکٹر جمیل جالبی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جن میں ان کے تحقیقی انداز اور اس کے فنی لوازم کو بہتر انداز میں نا صرف سمجھا جا سکتا ہے بلکہ دیگر شعبہ ہائے زبان اردو جیسے ادب اور شاعری وغیرہ کے بنیادی مسائل کی افہام و تفہیم کے لیے بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں جو مضامین جمع کیے گئے ہیں ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحقیق کے لوازمات کے حوالے سے لکھے گئے دو اہم مقالات "تحقیق کے جدید رجحانات" اور "اردو تحقیق کی روایت" شامل ہیں۔ زبان کی روایت کے متعلق لکھا گیا ان کا مقالہ "دکنی اور گجراتی ادب" بھی اسی کتاب کی زینت ہے۔ "دکنیات" اور دکنی ادب میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی دلچسپی تاریخ ادب اردو کے دور سے ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ ادبی تحقیق میں ان کے "دیوان نصرتی"، "دیوان شوقی" اور "مثنوی کدم راو پدم راو" کے مقدمات بھی درج ہیں۔ یہ مقدمات باقاعدہ تحقیقی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں تحقیق کے اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان شعرا کے متعلق کئی معموں کو حل کیا ہے۔ مثلاً حسن شوقی کے زمانے اور ادبی مقام کے تعین، اس سے منسوب غزلیات پر تحقیق، نصرتی کے نام اور حالات و واقعات پر تحقیق اور فخر دین نظامی کے نام اور حالات پر باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ دیگر مضامین میں "ولی کا سال وفات، دیباچہ گلزار عشق: محمد باقر آگاہ، نکات الشعرا کا تحقیقی مطالعہ، مصحفی کے تذکرے: ایک تجزیاتی مطالعہ، نساخ کا ایک نایاب تذکرہ: تذکرۂ المعاصرین، پاکستان کی

قدیم اردو شاعری اور بابا فرید کی اردو شاعری جیسے اعلیٰ تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ ذیل میں ان تمام موضوعات کا مختصر تعارف اور ان مقالات کی روشنی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے فن تحقیق کا جائزہ لیا جائے گا۔

اپنے تحقیقی مقالے "تحقیق کے جدید رجانات" میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے حقیقی نظریات کو واضح طور سے بیان کیا ہے۔ اس مقالے سے نہ صرف وہ تحقیق کے لوازمات کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ تحقیق کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق تحقیق ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس سے الگ ہو کے زندگی کے کسی شعبے میں آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ان کے مطابق معاشرے کی زندگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تحقیق کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ بے تحقیق معاشرے کو وہ سطح پر ناکارہ اور بے جان قرار دیتے ہیں۔ زندگی میں تحقیقی عمل کی ضرورت اور اس کی اہمیت کے متعلق وہ روزمرہ کے مثالوں سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ تحقیق محض ادب کی ضرورت یا پھر کوئی سائنسی یا علمی شئے نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں تحقیق کو دخل ہے۔ اس قدر اہمیت کا حامل ہونے کے باوجود شعبہ تحقیق کو ہمارے ہاں بالخصوص اردو ادب میں قرار واقعی اہمیت نہیں دی جاتی جس کے سبب ہمارا معاشرہ تیزی سے رو بہ زوال ہے۔ اپنے تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس عہد تک اردو تحقیق کی تمام چیدہ چیدہ اغلاط کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً میر تقی میر جیسے عظیم شاعر کا دیوان اس وقت تک مکمل مرتب نہیں ہوا تھا جس وجہ سے اردو شاعری کا ایک بہت بڑا باب ادھورا تھا جس کو تحقیق ہی کے ذریعے بھرا جاسکتا تھا۔ اسی طرح تحقیق کے فن کے حوالے سے انہوں نے محققین کی توجہ کئی نئے نکات کی طرف دلائی ہے۔ اس مقالے سے طویل مگر معنی خیز اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "تحقیق کی تعلیم و تربیت کا بھی ہماری یونیورسٹیوں میں کوئی انتظام نہیں ہے۔ شاید ہی کسی یونیورسٹی میں فن اور اصول تحقیق و تدوین کا الگ سے کوئی پرچہ رکھا گیا ہو۔ تحقیق کرنے والے اٹکل پچو کام شروع کر دیتے ہیں۔ کام کا آغاز کرتے وقت انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ مواد کہاں ملے گا۔ کون سے ماخذ معتبر ہیں اور کون سے نامعتبر ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ دوران تحقیق دوسرے درجے کے حوالے سے کیوں احتراز کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں اکثر بڑے اور اہم کتب خانوں کی وضاحتی فہرست بھی موجود نہیں ہیں۔ یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ قومی عجائب خانہ کراچی میں تقریباً بارہ تیرہ ہزار مخطوطات ہیں جن کی اب تک درجہ بندی بھی نہیں ہوئی ہے اور ان مخطوطات تک رسائی ناممکن ہے۔ ہمارے ہاں ببلیوگرافی کا بھی قحط ہے۔ "آکسفورڈ کمپینین آف انگلش لٹریچر" کی طرح کی بھی کوئی کتاب ہمارے ہاں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں تحقیق کا وہ معیار اور وہ روایت قائم نہیں ہوسکی جن سے کسی قوم کی قسمت بدل جاتی ہے۔"(۸)

درج بالا سطور میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کسی ماہر محقق کی طرح انتہائی کم الفاظ میں اردو تحقیق کے تمام جملہ مسائل کے سمندر کو گویا کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ان کی تحقیق کی ایک بہت اہم خصوصیت اختصار بھی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مختصر ترین الفاظ میں بڑے بڑے موضوعات اور مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ درج بالا اقتباس ان کی تحقیق کی اسی خوبی کا شاہد ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے

پاکستان میں تحقیق کی صورتحال، تحقیقی موضوعات میں تنوع اور روشن مستقبل، تحقیق کی حدود اور دائرہ کار کے تعین، فنی اور فکری اغلاط، جدید تحقیق کے رجحانات سمیت کئی اور مباحث پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ادبی تحقیق کا دوسرا مضمون دراصل اردو میں تحقیق کی روایت اور تحقیق شناسی کے حوالے سے دیا گیا جو ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک انٹرویو ہے۔ اس انٹرویو میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق سے متعلق اپنے نظریات کو صراحت سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس وقت کی تحقیقی صورتحال پر بھی تبادلہ خیال کیا ہے۔ اپنی مقصدیت اور تحقیق کی روایت کے متعلق اس انٹرویو میں جن نکات پر بحث کی گئی ہے وہ اردو تحقیق میں ایک خشتِ اوّل تھی جس نے آگے چل کر کئی تحقیقی مباحث کو جنم دیا۔ اس انٹرویو کی تحقیقی اہمیت کا اندازہ انٹرویور گوہر نوشاہی کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> "یہ انٹرویو ایک لحاظ سے اردو تحقیق کے موضوع پر پہلا بھرپور اور جامع "مصاحبہ" (انٹرویو) ہے۔ میں نے اپنے سوالات کو مختلف زاویے دینے کی کوشش کی ہے تاکہ اردو تحقیق کے بعض ایسے مسائل پر ڈاکٹر صاحب کے افکار و نظریات سامنے آجائیں جن پر ابھی تک بیشتر محققین نے دوٹوک اور واشگاف انداز میں بات نہیں کی۔"(۹)

یہ مصاحبہ مقصد کو کامیابی سے حاصل کرتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق کی روایت اور تحقیق شناسی کے حوالے سے پاکستان میں انگریزی کی موجودہ صورتحال پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ ان مصاحبات میں اردو تحقیق کے کئی مسائل کو حل کیا اور کئی نکات ایسے اٹھائے جو آگے چل کر اردو میں تحقیق کے نئے در وا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ پاکستان اور ہندوستان کے اہم محققین، پاکستان کے تحقیق ادارے اور تحقیق کے فروغ میں ان کے کردار، سندی تحقیق کی اہمیت، تحقیق کے معیار کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مصاحبے میں اپنے تحقیقی سفر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ "دکنی اور گجراتی ادب" کے حوالے سے اپنے تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے گجرات میں مسلمانوں کے تسلط، اردو زبان و ادب کے فروغ، بہمنی سلطنت کے قیام، اردو کی اشاعت میں اس کے کردار، بہمنی ریاست کے منقسم ہونے پر وجود میں آنے والی پانچوں ریاستوں میں اردو زبان اور ادب کی صورتحال بالخصوص بیجاپور اور گولکنڈہ کے اردو کے فروغ میں اہم کردار جیسے تحقیقی مباحث پیش کیے ہیں۔ یہ مقالہ اس لیے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ ادبیات دکن کے سلسلے میں یہ اولین تحقیقاتی کاوشات میں سے ایک ہے۔ ان ہی تحقیقات کو بنیاد بنا کر دیگر محققین نے دکنی ادب کے ارتقا کو سمجھا اور اردو کے دکنی سے اختلاط کے قدیم سوال کا تشفی آمیز جواب تلاش کیا۔ "ادبی تحقیق" کے دوسرے حصے میں مثنوی کدم راو پدم راو، دیوان نصرتی، دیوان شوقی کے مرتبہ دواوین کے مقدمات درج کیے ہیں۔ یہ معرکۃ الآرا مقدمات اردو تحقیق میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

اپنے تحقیقی مضمون "ولی کا سال وفات" میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کے سن وفات کے حوالے سے طویل عرصے سے پیدا شدہ نزاعی صورتحال پر معنی خیز تبصرہ کیا ہے۔ ایک عرصہ تک ولی کو اردو غزل کا باوا آدم سمجھا جاتا رہا ہے۔ میر تقی میر جیسے تغزل کے بادشاہ سمیت سبھی شعرا نے ولی کے فن کا لوہا مانا ہے۔ غزل میں اولیت اور عمومی شاعری میں ولی کی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ولی کے بارے میں تمام تر معلومات تصدیق کے ساتھ اردو روایت کا حصہ بنائی جائیں۔ ولی کے کلام کو سمجھنا ہے تو ولی کے حالات سے واقفیت ہونا از

حد ضروری ہے چونکہ ولیؔ کے کلام کو اردو میں اولیت حاصل ہے لہذا اس کے کلام کو پڑھنا اور سمجھنا اردو شاعری کی روایت میں بے حد اہم گردانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مقالے "ولی کا سال وفات" میں لکھتے ہیں کہ ولی کی زندگی وطن اور صالح وفات پر اردو تحقیق میں اتنی بات کی جا چکی ہے کہ یہ بحث تاریخ ادب اردو کا الگ حصہ بن چکی ہے لیکن اتنے مباحث کے باوجود آج بھی ولی کے سال وفات کا تعین نہیں کیا جا سکا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختلف اہل علم و ادب کے ان بیانات کو نقل کیا ہے جو ولی کی تاریخ وفات سے متعلق ہیں۔ مثلاً سید احمد دہلوی کے مطابق ولیؔ کا سن وفات ۱۰۰۱ھ ہے جب کہ احسن مارہروی کے مطابق ولیؔ کم از کم ۱۱۴۱ھ تک ضرور حیات تھے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق ولیؔ کا سن وفات ۱۱۱۸ھ، محمد یحیی تنہا کے مطابق ۱۱۵۱ھ ہے۔ دیگر محققین جنہوں نے اس ضمن میں تحقیق کی ان میں سردار عبدالحمید، قاضی احمد میاں جوناگڑھی اور صدرالدین فضا شمسی کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختصراً ان تمام محققین کی تحقیق کے نتائج اپنے مقالے میں درج کیے ہیں۔ مختصر مگر جامع انداز میں تمام محققین کے مباحث کا جائزہ لینے کے بعد وہ اپنی تحقیق سے چند اہم نکات مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مثلاً طویل عرصے تک جس شعر کو بنیاد بنا کر ولیؔ کے سال وفات کا تعین کیا جاتا رہا وہ شعر ولیؔ کا نہیں بلکہ شرف الدین مضمون کا ہے۔ ثناء اللہ کے مکتوب دیوانِ ولیؔ کا سن اشاعت ۱۱۳۸ھ ہے جس میں ولیؔ کو مرحوم کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ ایسے تمام نکات کا جو اس بحث میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں، ڈاکٹر جمیل جالبی نے عمیق نظری سے جائزہ لیا ہے۔ تمام محققین کے مباحث کا جائزہ لینے کے بعد ولی کے سال وفات کے تعین سے پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ تمام مباحث اس مسئلے کو مزید الجھا دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "یہ سب باتیں ایسی الجھا دینے والی ہیں کہ آدمی اسی میں عافیت جانتا ہے کہ ۱۱۱۹ھ ہی کو صحیح سال وفات تسلیم کر لیا جائے۔ اس بات کی تردید اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک نیا مواد سامنے نہ آئے جو پورے طور سے ۱۱۱۹ھ کو غلط ثابت نہ کر دے۔ "تاریخ ادب اردو" پر کام کے دوران موجود سینکڑوں مخطوطات کے مطالعے کی ضرورت پڑی اور اس مطالعے کے دوران چند ایسے مخطوطات بھی نظر سے گزرے جن سے ولیؔ کے سال وفات پر مزید روشنی پڑتی تھی۔ "(۱۰)

مندرجہ بالا بیان کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے تمام محققین کا دلائل سے رد کیا ہے۔ بعد میں مولوی عبدالحق کی دریافت شدہ تاریخ وفات کو انہوں نے اپنی تحقیق سے غلط قرار دیا۔ اور مختلف مخطوطات کی داخلی شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ ولیؔ کے ۱۱۱۹ھ کے بعد زندہ رہنے بلکہ سن رسیدہ ہو کے انتقال کرنے کے شواہد کئی کتب سے دستیاب ہیں۔ تمام داخلی شہادتوں کے بیان کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولیؔ کے معاصر فراقی کے کلام سے داخلی شہادتوں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ ولیؔ کم و بیش ۱۱۳۳ھ یعنی ۱۷۲۰/۲۱ تک حیات تھے۔ ۱۱۳۸ھ میں جب ثناء اللہ نے دیوان ولی نقل کیا تو ولی کے لئے مرحوم کا لفظ لکھا۔ یعنی ولیؔ کی وفات ۱۱۱۹ھ ہرگز قرار نہیں دی جا سکتی۔ مذکورہ شواہد کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق کو بروئے کار لا کے ولی کے اپنے کلام سے داخلی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ولیؔ نے ایک شعر

میں دہلی کے صوبیدار محمد یار خان کا ذکر کیا ہے اس صوبیدار کے عہد حکومت کے متعلق زمانی تحقیق کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ نہیں بلکہ ۱۷۲۰ء-۱۷۲۶ء کے درمیان کا زمانہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"حالات و شواہد کی روشنی میں ولی کو ۱۱۱۹ھ میں مار کر تحقیق کے دروازے بند کر کے بیٹھ جانا تاریخ کا ایک حیرت ناک واقعہ ہے۔ اس بحث کی روشنی میں ولی کا سال وفات ۱۱۳۳ھ کے بعد اور ۱۱۳۸ھ سے پہلے متعین ہو جاتا ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی محققانہ خصوصیات کا ایک اور مظہر "دیباچہ گلزار عشق: محمد باقر آگاہ" ہے۔ اپنے اس تحقیقی مقالے میں جمیل جالبی نے ناصرف اس دیباچے کو وضاحت سے بیان کیا ہے بلکہ محمد باقر آگاہ کا مختصر تعارف بھی پیش کر دیا ہے تاکہ مثنوی گلزار عشق کے مصنف کے متعلق قارئین کو چیدہ چیدہ معلومات فراہم کی جا سکیں۔ محمد باقر آگاہ اٹھارہویں صدی کے نسبتاً کم مقبول مثنوی گو ہیں۔ اگرچہ انہوں نے دیگر کی مثنویات بھی تحریر کیں مگر گلزار عشق خاصی مقبول ہوئی۔ اپنی تحقیق سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے محمد باقر آگاہ جیسے کم معروف شاعر کے حالات زندگی اور دیگر کلام کا سراغ لگایا ہے۔ ان کے مطابق محمد باقر آگاہ ۱۱۵۸ھ میں شہر ایلور یعنی موجودہ مدراس میں پیدا ہوئے۔ دستور زمانہ کے مطابق عربی فارسی اور اردو میں تحصیل علم کیا۔ فنی خصائص سے مالامال تھے لہٰذا تینوں ہی زبانوں میں شاعری میں طبع آزمائی کی اور انھیں نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ گلزار عشق کے علاوہ ان کی تصانیف میں تحفہ النساء، ریاض الجنان، روضۃ الاسلام، صبح نو بہار عشق، محبوب القلوب، ریاض السیر، احسن النبین، تحفۂ الاحباب اور کرامات قادریہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان معلومات کے اندراج کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے گلزار عشق کے دیباچے کو پیش کیا ہے۔ اس دیباچے میں انھوں نے تحقیق و تدوین کے جو التزامات برتے ہیں ان کی بھی مختصر اوضاحت کی ہے تاکہ قارئین کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانی بہم پہنچائی جا سکے اور وہ اس دیباچے سے حِظ اٹھا سکیں۔ یہ خصوصاً ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کو ایک طرح کی عملیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس انداز تحقیق سے نہ صرف پڑھنے والے کے لیے قدیم الفاظ کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ قدیم دور کے یہ مخطوطات جدید زبان کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے دیر تک زبان میں محفوظ رہتے ہیں۔ نکات الشعرا میر تقی میر کی وہ شہرہ آفاق کتاب ہے جو اردو تذکروں میں ایک معتبر حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تذکرہ کئی اردو شعرا کے تعارف اور نمونہ کلام کو جاننے کے لیے بے حد اہم ہے۔ اس تذکرے کی اہمیت اور اولیت کے پیش نظر تقریباً سبھی محققین نے اس کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ اپنے تحقیقی اور تنقیدی مقالے "نکات الشعراء کا تحقیدی مطالعہ" میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ نکات الشعراء ۱۷۵۲ء میں مکمل ہوئی اور اس میں کم و بیش ۱۰۳ شعرا کے بارے میں معلومات اور ۱۲۶۰ اشعار درج ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مقالے میں ان تمام شعراء کے شعروں کی تعداد کی بھی وضاحت کی ہے۔ مختلف مباحث کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نکات الشعرا کم و بیش ۱۱۶۵ھ تک زیر تحریر ہی رہا اور میر آس میں مسلسل اضافہ کرتے رہے۔ اس تذکرہ کے معاصر تذکروں میں جمیل جالبی نے مجمع النفائس، گلشن گفتار، تحفۂ الشعرا، تذکرہ ریختہ گویاں اور مخزن نکات کے نام پیش کیے ہیں۔ ان تذکروں کے مصنفین اور ان کا مختصر حال بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے درج کیا ہے۔ میر تقی میر کے

تذکرہ نکات الشعرا کو اردو میں اس قدر اہمیت حاصل ہوئی کہ اس کے فنی عیوب سے بالکل صرف نظر کر لی گئی۔ اس کی اولیت اور میرؔ سے اس کے منسوب ہونے کی وجہ سے اس کتاب میں جو فنی خرابیاں موجود ہیں ان پر بات کرنا ممنوع قرار پایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی محققین کی اس اول فہرست میں سے ہیں جنہوں نے اس کتاب کے فنی اور فکری محاسن کا مطالعہ بنا کسی مرغوبیت کیا اور اس کتاب کی فنی خرابیوں پر بھی نگاہ کی۔ مثلاً اس تذکرے کی زمانی بے ترتیبی، ذاتی عناد کی بنا پر تذکرے سے گریز، تحقیق میں عدم دلچسپی، اور معاصرین سے ذاتی چشمک کی وجہ سے ان کے ادبی وقار میں کمی کرنا جیسے کئی فکری مسائل جو اس تذکرے میں موجود ہیں، کا مطالعہ جالبی صاحب نے پیش کیا ہے۔ بالخصوص ان نکات الشعرا کی بے ترتیبی اور بے ربطی پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے خاصی کڑی گرفت کی ہے۔ ان کے مطابق نکات الشعرا میں اتنی ترتیب بھی نہیں ہے جو مخزن نکات میں ہے، اس حقیقت کے باوجود کے مقصد نکات کی ترتیب صرف طبقاتی اعتبار سے دی گئی ہے۔ مثلاً دکنی ادب سے عدم دلچسپی کی وجہ سے میرؔ نے ولیؔ دکنی جیسے بڑے شاعر کا ذکر صرف چھ سطور میں کیا ہے اسی طرح کئی اہم دکنی شعرا کو ذاتی غیر دلچسپی کی وجہ سے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ میر نے اس تذکرے میں جو جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس پر مفصل تحقیقی آرا پیش کی ہیں۔ میر نے ان تمام شعرا کے ذکر میں جانبداری برتی ہے جو ان کے ذاتی احباب میں سے تھے یا ان کے محسنین سے متعلق تھے۔ ایسے تمام شعرا کے علاوہ جو بھی شاعر اس دور میں موجود تھے میرؔ نے ان کے فنی رتبے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ان کے ادبی مقام کو گرایا جاسکے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے احسان اللہ بیان، انعام اللہ خان یقینؔ، شاہ حاتمؔ، یکرنگ، ثاقبؔ، عاجزؔ، قدرؔ اور دیگر کئی شعرا کا حوالہ دیا ہے جنہیں میرؔ نے ذاتی عناد کی وجہ سے نظر انداز کئے رکھا یا ان کے بارے میں لغو معلومات تذکرے میں درج کیں۔ ان شعرا کے کلام پر میر نے جو اصلاح دی اور جو تصریفات کیں ان کے بارے میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس تحقیقی مقالے میں گرفت کی گئی ہے۔ فکری رویوں سے ہٹ کر تذکرہ نکات الشعرا میں جو فنی خرابیاں میرؔ سے سرزد ہوئی ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان پر بھی نگاہ کی ہے۔ مثلاً مقالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "نکات الشعراء" میں حالات زندگی اور واقعات بہت مختصر ہیں۔ ولادت، وفات اور واقعات کے سنین لکھنے سے میر صاحب کو کوئی رغبت نہیں ہے۔ کئی مقامات پر تو صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ ان کا احوال مفصل طور پر فارسی تذکروں میں مسطور ہے۔ مثلاً حضرت امیر خسرو کے ذیل میں لکھا ہے کہ "احوال امیر مذکور در تذکرہ ھا مسطور" یہی بات بیدل، مرزا معز فطرت اور مرزا گرامی کے سلسلے میں لکھی ہے۔ تفصیل سے میر صاحب گھبراتے ہیں جیسا خود ٹیک چند بہار کے ذکر میں لکھا ہے "دماغ تفصیل ندارم۔"(۱۲)

ان فنی اور فکری کجیوں سے ہٹ کر جمیل جالبی نے نکات الشعرا کے محاسن کا بھی بیان کیا ہے۔ ایک سچے محقق کی طرح وہ میرؔ کے ادبی رتبے سے متاثر ہوئے بغیر اس تذکرے پر بےلاگ رائے دیتے ہیں اور اس کے محاسن اور عیوب کا مطالعہ یکساں نظر سے کرتے ہیں۔

"مصحفی کے تذکرے: ایک تجزیاتی مطالعہ "کلاسیکی شعرا کے حوالے سے لکھا گیا ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک اور اہم تحقیقی مقالہ

ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مصحفیؔ کے لکھے تین تذکروں "عقد ثریا"، "تذکرہ ہندی" اور "ریاض الفصحا" کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ "عقد ثریا" مصحفیؔ کا لکھا پہلا تذکرہ ہے جس کا سن تکمیل ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۱۹۹ھ متعین کیا ہے۔ اس تذکرے میں مصحفی نے محمد شاہ کے عہد سے لے کر شاہ عالم تک کے عہد کے تمام شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اس ذکر میں مصحفیؔ نے جو خصوصی التزام برتا ہے وہ یہ ہے کہ ان شعرا کے انتخابی کلام کو حروف تہجی کے اعتبار سے درج کیا گیا ہے اور کسی شاعر سے صرف نظر کرنے کی وجہ بھی الگ سے بیان کر دی ہے۔ اس تذکرے کو لکھنے کے لیے مصحفی نے جن پیشرو تذکرہ نگاروں اور مورخین نے ادب سے استفادہ کیا ہے ان کا بیان بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے۔ شاعروں کے بارے میں دی گئی ذاتی آرا سے مصحفی کی شخصیت کے بارے میں جو دلچسپ معلومات ملتی ہیں وہ بھی اس مقالے کا حصہ بنائی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں اس تذکرہ کے سالِ آغاز کا پتا بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے داخلی شواہد کے ذریعے لگایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مصحفی نے "عقد ثریا" کا سال اختتام ۱۱۹۹ھ تو دیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتایا کہ اس تذکرہ کا آغاز کب ہوا تھا؟ داخلی شواہد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس تذکرہ کا آغاز ۱۱۹۴ھ میں یا اس سے پہلے ہو چکا تھا "(۱۳)

مصحفیؔ کے دوسرے تذکرے "تذکرہ ہندی" کے آغاز کا بھی جمیل جالبی نے پتا لگایا ہے۔ ان کے مطابق مصحفیؔ نے تذکرے کا آغاز "عقد ثریا" کی تکمیل کے فوری بعد یعنی ۱۲۰۰ھ ہی میں کر دیا تھا۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بھی انھوں نے تذکرے سے داخلی شواہد پیش کیے ہیں۔ سنِ آغاز کے علاوہ اس تذکرے کے مقام آغاز کا تعین بھی انھی داخلی شہادتوں سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقات کے مطابق یہ دہلی میں احاطہ تحریر میں آیا۔ اس تذکرے کی تکمیل میں مصحفیؔ نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ان میں تذکرہ میر حسن اور مخزن نکات قابل ذکر ہیں۔ اس تذکرے میں مصحفیؔ نے دیدہ اور شنیدہ شخصیات و حالات دونوں کی وضاحت الگ الگ کی ہے اور جہاں کہیں کسی کی ایما پر معلومات کا اندراج کیا وہاں بھی وضاحت کر دی ہے۔ ان اقدامات کی وجہ سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بطور محقق مصحفیؔ کے اس تذکرے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مصحفیؔ کے تیسرے تذکرہ "ریاض الفصحا" میں بھی معیار کا یہی التزام رکھا گیا ہے۔ اس تذکرے کا سال آغاز ۱۲۲۱ھ ہے اور اسے چنی لال حریف کی ایما پر لکھا گیا۔ ریاض الفصحا چونکہ ان کا تیسرا تذکرہ ہے لہذا اس کا فنی معیار گزشتہ دونوں تذکروں سے بلند ہے۔ اس تذکرے میں کئی عظیم شعرا مثلاً آتش اور ناسخ جو اس دور کے نوجوان شعرا میں شامل تھے کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ گویا مصحفیؔ نے عمر اور تعداد کلام کے فرق سے قطع نظر غیر جانب دارانہ انداز میں تمام شعرا کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے۔ ریاض الفصحا کو مصحفیؔ نے ایک خاص ترتیب میں لکھا ہے۔ اس مقررہ انداز تحریر کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"ریاض الفصحا کا عام طور پر ایک مقررہ ڈھنگ ہے مثلاً مصحفی عام طور پر یہ بتاتے ہیں کہ یہ شاعر کس کا شاگرد ہے۔ اس کی عمر کیا ہے۔ اس کا کلام کیسا ہے اور اگر کوئی قابل ذکر دلچسپ بات ہوتی ہے تو وہ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ آخر میں انتخاب کلام دے کر شاعر سے متعارف کرا دیتے ہیں تا کہ پڑھنے والا ذرا سے تعارف کے بعد انتخاب کلام پڑھ کر اس کی شاعرانہ حیثیت کا اندازہ لگا سکے۔"(۱۴)

ریاض الفصحا اپنے دور کے شعرا کی ایک ایسی دستاویز ہے جو اگر موجود نہ ہوتی تو اس دور کے شعرا، ذوق سخن اور اپنے عہد کے نئے رجحانات سے ہمیں آگاہی نہ ہوتی۔ اپنے اس تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے "ریاض الفصحا" اور مصحفی کے لکھے دیگر دونوں تذکروں کی مسلم اہمیت کو واضح کیا ہے۔

"نساخ کا ایک نایاب تذکرہ: تذکرہ المعاصرین" ڈاکٹر جمیل جالبی کی محققانہ خصوصیات کا ایک مظہر ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس قدر بلند ہے کہ اس ایک مقالے کی بنا پر انھیں اردو ادب کے صف اول کے محققین میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مصنف کے حالات واقعات یہاں تک کہ اس کے نام کی بھی معلومات ڈاکٹر جمیل جالبی کو دستیاب نہ تھیں مگر انہوں نے اپنے کتب خانے میں موجود اس تذکرے کے مصنف کا نام کھوج نکالا بلکہ اس کے حالات زندگی اور دیگر کا تمام احوال اس مقالے میں درج کیا ہے۔ اس تذکرہ کی دریافت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ یہ تذکرہ ایک عرصے سے ان کے کتب خانے میں موجود تھا مگر اس کے آغاز کے صفحات نہایت شکستہ ہونے کے سبب پڑھنے لائق نہیں تھے۔ باقی تذکرے کی حالت بھی دگرگوں تھی اسے خوش قسمتی کہیئے یا ڈاکٹر جمیل جالبی کے کثیر المطالعاتی ذہن کا کرشمہ سمجھئے کہ ایک روز ڈاکٹر محمد صدر الحق کی کتاب "نساخ: حیات و تصنیف" کا مطالعہ کرتے ہوئے "تذکرۂ المعاصرین" کے نام پر وہ چونک گئے۔ مذکورہ تذکرے کو جب انہوں نے اپنے کتب خانے میں موجود تذکرہ سے ملایا تو مماثلتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ایک ہی نسخے کی دو نقول ہیں۔ صفحات کی تعداد یکساں، نام ایک اور طبع خانہ ڈھاکا یونیورسٹی دونوں نسخوں کی مماثلت ثابت کر رہا تھا۔ جہاں ڈاکٹر جمیل جالبی کے کتب خانے میں موجود اس بے مصنف کے تذکرے کو ایک پہچان ملی وہیں ڈاکٹر جمیل جالبی کو اردو ادب میں ایک ایسا تذکرہ متعارف کرانے کا ذریعہ میسر آیا جو ان سے پہلے تاریخ ادب کا حصہ نہیں بنایا گیا تھا۔ اپنے اس تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نساخ کے سوانحی حالات بھی درج کیے ہیں۔ عبد الغفور خاں نساخ انیسویں صدی کے ایک صاحب علم انسان تھے جنہوں نے دیگر کتب بھی تحریر کیں۔ زمام گردش کے سبب ان کی تحریں بکھر گئیں اور ان کے علمی سرمائے کو محفوظ نہ کیا جا سکا تاہم تذکرہ المعاصرین کی دریافت سے نہ صرف ان کے علمی رتبے کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس دور میں فارسی شعرا کے اثر و رسوخ کا بھی پتا چلتا ہے۔ نساخ اپنے دور کے جدید تعلیم یافتہ انسان تھے لہٰذا ان کا نقطہ نظر کسی عام شاعر تذکرہ نگار سے قدرے مختلف ہے۔ نساخ خود بھی شاعری کرتے تھے اور اس تذکرے میں ان کے لکھے ہوئے کئی قطعاتِ تاریخِ وفات ملتے ہیں۔ اس تذکرے میں کم و بیش اَسّی شعر درج ہیں جن کے مختصر حالات و واقعات بھی تذکرہ کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ اس تذکرہ کی اہمیت اس بنا پر دوچند ہو جاتی ہے کہ یہ تذکرہ اردو شاعری کے دور دوم کے شعرا سے متعلق ہے لہذا اس میں ایسے کئی شعرا کے نام ملتے ہیں جو قدیم تذکروں میں نہیں ملتے۔ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر اس تذکرہ کو اردو ادب میں ایک انفرادی حیثیت حاصل ہوئی جس کا سہرا یقیناً ڈاکٹر جمیل جالبی ہی کے سر ہے۔

"پاکستان کی قدیم اردو شاعری" شاعری کے حوالے سے لکھا گیا ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک اور اہم تحقیقی مقالہ ہے اس مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان تمام مقامی بولیوں کا ذکر کیا ہے جو بولی کے درجے کو پا کر ٹھہر گئیں یا پھر زبان کے درجے کو پہنچ گئیں۔ ان تمام

زبانوں میں سے اردو کو ہم مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کی آبرو سمجھتے ہیں اور اس کے شعری ورثے کو خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کی قدیم اردو شاعری کو بیان کرنے کے لیے وہ اس عہد کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے اس کا فکری مطالعہ کرتے ہیں۔ فنی مطالعہ کی ذیل میں بھی انھوں نے اپنی تحقیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر ایسی کئی مثالیں درج کی ہیں جو قدیم اردو اور دیگر مقامی زبانوں میں مماثلت کی مظہر ہیں۔ شاعری کے حوالے سے ان کا لکھا ایک اور اہم تحقیقی مقالہ "بابا فرید کی اردو شاعری" ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر برصغیر کے جید بزرگ اولیا میں سے ایک ہیں۔ اگرچہ ان کا زیادہ تر کلام پنجابی میں ہے مگر انہوں نے اردو زبان میں بھی طبع آزمائی کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں بابا فرید کی اردو شاعری کا فنی اور فکری مطالعہ پیش کیا ہے۔

الغرض تحقیق کے لوازمات کو جزئیات سے سمجھنا ہو تو یہ کتاب نو آموز محققین کے لئے مشعل راہ ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے انتقال سے اردو زبان و تحقیق میں ایک ایسا مہیب خلا پیدا ہو گیا ہے جسے شاید کبھی عبور نہ کیا جا سکے۔

حوالہ جات

۱۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت، لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۱۴ء، ص ۴۳۶

۲۔ محمد اشرف کمال، تحقیق اور تدوین متن، کراچی: سٹی بک پوائینٹ، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰

۳۔ عبد الحمید خان عباسی، ڈاکٹر، اصول تحقیق، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵ء، ص ۸۹

۴۔ سلطان محمود، رانا، فن تحقیق مبادیات، اصول اور تقاضے، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

۵۔ رفاقت علی شاہد، ڈاکٹر، تحقیق شناسی، لاہور: القمر انٹر پرائزز اردو بازار، ۲۰۱۳ء، ص ۳۰

۶۔ عطش درانی، ڈاکٹر، جدید رسمیات تحقیق، لاہور: عدن پرنٹرز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱

۷۔ احمد ندیم قاسمی، پیش کلام، مشمولہ: ادبی تحقیق از ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء، ص ۹

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵

۹۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۰۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۲۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۳۸